سلسلۂ اشاعت نمبر۸۰

بہ فیض: تاج دار اہلِ سُنّت مفتی اعظم علامہ محمد مصطفیٰ رضا نوری علیہ الرحمہ وحضور تاج الشریعہ مدظلہ العالی

زیر سرپرستی: امینِ ملت حضرت ڈاکٹر سید محمد امین میاں قادری برکاتی مدظلہ العالی، مارہرہ مطہرہ

مفتی اعظم کا زُہد وتقویٰ

بحرالعلوم حضرت مفتی عبدالمنان اعظمی مصباحی علیہ الرحمہ

سابق شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

ناشر: **نوری مشن** مالیگاؤں

ملنے کا پتا: مدینہ کتاب گھر، اولڈ آگرہ روڈ، مالیگاؤں Cell. 9325028586

سنِ اشاعت ۱۴۳۷ھ/ ۲۰۱۵ء...... ہدیہ: دُعائے خیر

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

انسانوں میں پائی جانے والی خوبیوں کی دو بنیادی قسمیں ہیں: (۱) ذاتی (۲) اضافی

آدمی کی اضافی خوبیوں سے ہماری مراد وہ بڑائیاں ہیں جو کسی فرد کو کسی دوسری بڑی چیز سے رشتہ اور علاقہ کی بنیاد پر حاصل ہوں۔ مثلاً -زید- بہت بڑا آدمی ہے اس لیے کہ ایک بہت بڑے آدمی کا لڑکا ہے، -عمر- ایک بہت اونچا انسان ہے اس لیے کہ وہ ایک عالی خاندان کا فرد ہے، - بکر- ایک گریٹ جنٹل مین ہے، اس لیے کہ وہ ایک فیمس جگہ کا رہنے والا ہے۔ الغرض! وہ ساری خوبیاں جو خود انسان میں نہ ہوں بلکہ کسی بڑی سوسائٹی کا فرد، یا بڑے مقام کا باشندہ ہونے یا بڑے آدمی کے رشتہ ناطہ کے ذریعہ آدمی کو بڑا بناتی ہوں، وہ ہمارے نزدیک اضافی خوبی ہے۔ ہر چند کہ یہ خوبی انسان کی اصلی خوبی نہیں شمار کی جاتی۔ چناں چہ شعرانے اس کی مذمت کی، حضرت سعدی فرماتے ہیں ؎

ہنر بنا اگر داری نہ جوہر
گل از خارست و ابراہیم از آزر

’’تم میں کوئی خوبی اور کمال ہو تو دکھاؤ، تم اپنے حسب ونسب کی بڑائی نہ شمار کراؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ پھول کانٹوں کے ہجوم میں مسکراتا ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام آذر بت پرست کے گھر میں ہوئے۔‘‘

اور حدیث پاک میں اسی پر تنقید کی گئی:

من ابطأبه عمله لم یسرع به نسبه. (مشکوٰۃ شریف، ص۳۳، کتاب العلم)

جس آدمی کو اس کا عمل سُست کردے اس کو اس کا خاندان آگے نہیں بڑھا سکتا، بلکہ خود قرآنِ عظیم میں بھی بڑائی اور بزرگی کا معیار نسب کو نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ اصلی اور ذاتی

خوبیوں کو ہی کرامت کا معیار قرار دیا گیا۔

ارشاد ربانی ہے: **اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ.** (سورۂ حجرات ۴۹/۱۳)

’’ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔‘‘

مگر اضافی خوبی کی یہ ساری تنقید اسی صورت میں ہے کہ آدمی صرف اضافی خوبیوں پر ہی اترائے، ذاتی خوبیاں اس کے پاس کچھ نہ ہوں۔ ورنہ ذاتی خوبیوں کے ساتھ مل کر یہ اضافی خوبی بھی حسن و زیبائش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ایک دفعہ صحابہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا:

من اکرم الناس یارسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بزرگ کون ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فاکرم الناس یوسف نبی اللّٰہ بن نبی اللّٰہ ابن نبی اللّٰہ ابن خلیل اللّٰہ.

(بخاری شریف، حدیث ۳۳۷۴، احادیث کتاب الانبیاء، دار الکتاب العربی، بیروت)

’’حضرت یوسف علیہ السلام سب سے بزرگ ہیں کہ خود نبی ان کے باپ نبی ان کے دادا نبی اور پردادا تو ابراہیم خلیل اللہ۔‘‘

ایک دفعہ خود اپنا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: **ان اللّٰہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد اسماعیل واصطفیٰ قریشا من کنانۃ و من قریش بنی ھاشم واصطفانی من بنی ھاشم.** (مشکوٰۃ المصابیح ص ۵۱۱، باب فضائل سید المرسلین، الفصل الاول مجلس البرکات مبارک پور)

’’اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسماعیل میں سے قبیلہ بنو کنانہ کو منتخب فرمایا، اور بنو کنانہ میں سے قریش کے خاندان کا انتخاب کیا، اور قریش میں بنو ہاشم کو اعزاز بخشا اور ان میں مجھ کو نبی

مصطفیٰ اور حبیب رب السما بنایا۔‘‘

یہ دونوں حدیثیں بہ بانگِ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ نسبی فضیلت اور خاندانی وجاہت بھی، باعثِ مدح و ستائش اور سببِ فضل و شرف ہے۔

ایک اور حدیث میں تو آپ نے خود اپنی ذات سے نسبی اور سببی علاقہ رکھنے والوں کی ایک غیر معمولی خوبی کا ذکر کیا۔ چناں چہ ارشاد ہے:

کل نسب و سبب یقطع یوم القیامۃ الانسبی و صھری

(کنز العمال، حدیث ۳۱۹۱۵، بیت الافکار الدولیہ، الریاض)

’’تمام رشتے اور ناطے قیامت کے دن منقطع ہو جائیں گے میرے رشتے اور ناطے کے علاوہ۔‘‘

اور اسی علاقے پر مباہات کرتے ہوئے حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا ؎

وبنت محمد خدنی و عرسی

مسوط لحمھا بدمی و لحمی

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی میری ہم راز اور میری دُلھن ہے، میرا اور ان کا خون اور گوشت ایک دوسرے سے مخلوط ہو گیا ہے۔‘‘

الغرض! انسان کی اضافی خوبی بھی قابلِ لحاظ خوبیوں میں سے ہے، جب کہ وہ ذاتی محاسن سے عاری نہ ہو۔ پھر ذاتی محاسن کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) وہبی (۲) کسبی

وہبی خوبیوں کے دائرے میں وہ محاسن آتے ہیں جن کے حصول میں خود انسان کی اپنی کد و کاوش اور جد و جہد کو اتنا دخل نہیں ہو۔ جیسے رنگ و روغن کی خوش نمائی، قد و قامت کی دل رُبائی، اعضا کی موزونیت اور شخصیت کی دل کشی؛ اور کسبی خوبیوں کی تو ایک لمبی فہرست ہے جنھیں ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہر شخص انھیں جانتا پہچانتا ہے۔

اور یہ دونوں خوبیاں فی الحقیقت ایسی ہیں جو انسان کے فضل و شرف کا معیار ہیں

اور جن کی بدولت ایک کم حیثیت آدمی بھی اوجِ ثریا تک بلند پروازی کرسکتا ہے۔ بلکہ شہرت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچتا ہے۔اس میں بھی آخر الذکر کو اول الذکر پر غیر معمولی فضیلت حاصل ہے۔

بریلی کے غیر مسلموں کی زبان میں- بڑے مولانا صاحب- اور پورے ہندوستان کے سُنیوں کی زبان پر-مفتی اعظم- (علامہ مفتی محمد مصطفیٰ رضا خاں قادری برکاتی نوری بریلوی) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انھیں غیر معمولی انسانوں میں سے ہیں جنھیں قدرت نے اصلی اوراضافی وہبی اور کسبی، سبھی قسم کی غیر معمولی خوبیوں سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔

اضافی خوبیاں:

سب سے پہلے میں آپ کی اضافی خوبیوں کا ایک شمہ بیان کرتا ہوں۔آپ کے والد ماجد مجدد مائۃ رابع عشر حضرت مولانا الشاہ احمد رضا خان صاحب قدس سرہ العزیز انسانی شکل وصورت میں- آیۃ مـن آیـات الـلّٰـہ- (اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی) تھے۔

انھوں نے اپنی زبان کی لافانی تسخیری قوت، اپنی تحریر کا بے مثال زور اور اس کی غیر معمولی تاثیرِ روح اور اپنے بیکراں علم کا خزانۂ عامرہ استعمال کرکے، بلکہ اپنی ذات کی تمام توانائیاں نچوڑ کر اسلام کے رُخِ زیبا پر جمی ہوئی صدیوں کی گرد صاف کی، جس کے نتیجے میں اسلام کا حسنِ فطرت نئی آب وتاب کے ساتھ دُنیا کے سامنے جلوہ گر ہوا اور اسی وجہ سے اہلِ حق نے آپ کو- مجدد- گردانا اور اہلِ زیغ نے -بدعتی- کہا، یہ اُن کی نگاہوں کا قصور اور طرزِ ادا کی خرابی تھی؛ ورنہ انھوں نے بھی وہی دیکھا جو ساری دُنیا کے حق پرستوں کو نظر آیا اور جسے حدیث مبارک میں بیان کیا گیا:

ان الـلّٰه عزوجل يبعث لهذه الامة على راس كل مائة سنة من يجدد لها دينها (ابوداؤد،مشکوٰۃ مع مرآۃ،ص۲۱۴) **ان الـلّٰـه تعالىٰ يبعث على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها.**

’’بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایک مجدد مبعوث فرماتا ہے، جو دین کو نئی آب و

تاب دیتا ہے۔‘‘

آپ کے دادا حضرت مولانا نقی علی خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وقت کے امام اور اہلِ دل صوفیوں کے سرخیل تھے۔ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ اور حق پرست خوش عقیدہ مسلمانوں کے سالارِ کارواں تھے۔ مولوی رحمان علی صاحب اپنی کتاب ’’تذکرہ علماے ہند‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’ذہن ثاقب ورائے صائب داشت، خداے تعالیٰ وے را بعقل معاد و معاش ممتاز اقران آفریدہ بود۔ علاوہ شجاعت جبلی بصفت سخاوت وتواضع واستغنا موصوف بود۔ وعمر گراں مایۂ خود باشاعت سنت وازالۂ بدعت بسر برد۔‘‘

’’آپ تیز ذہن اور درست رائے رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاد و معاش کی دانش وری میں اپنے زمانہ والوں سے ممتاز بنایا تھا۔ ان میں فطری شجاعت کے ساتھ سخاوت، تواضع اور بے نیازی بھی تھی۔ اپنی پوری عمر سنت کی حمایت اور بدعت کی نکایت میں بسر کی۔‘‘

آپ کے دادا رضا علی خان رحمۃ اللہ علیہ عارف کامل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، سالکان راہِ جذب اور رہ روانِ راہِ سلوک- دونوں ہی آپ کی عظمت وسیادت کے معترف تھے۔ چہرہ دیکھ کر نوشتۂ تقدیر پڑھ لیتے اور حال کے آئینے میں مستقبل کی تصویر دیکھ لیتے۔ مجدد مائۃ رابع عشر حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کو ولادت کے بعد آپ کی گود میں رکھا گیا۔ دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا: میرا یہ بیٹا بہت بڑا عالمِ دین ہوگا۔

الغرض! جہاں تک آپ کے نسب کا سلسلہ تاریخ کی روشنی میں ہے۔ سلسلہ کا ہر فرد گلِ سرسبد اور ہار کی ہر لڑی- واسطۃ القلادہ- ہے؛ لیکن اوپر پانچویں پشت میں حضرت محمد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے؛ کیوں کہ انھوں نے بھی دولت وثروت کو لات مار کر زہد وتقویٰ اختیار فرمایا۔ اور ایک حکمران خاندان آپ ہی کی ہمت اور اولوالعزمی سے علم و عرفان کی راہوں پر چل پڑا۔ خود یہ بھی سلطان شاہ محمد خان کے وزیر اور ان کے والد سعادت یار خان وزیرِ مالیات، اور دادا حضرت سعید اللہ خان صاحب ملقب بہ شجاعت جنگ بہادر منصبِ شش ہزاری پر فائز تھے۔ اور یہی وہ بزرگ ہیں جو قندھار سے ہندوستان تشریف لائے۔ جن

کی وجہ سے چودھویں صدی میں تجدید و احیاے دین کی دولت ہندوستان کے حصے میں آئی۔

پس آبا و اَجداد کی شرافت و کرامت اگر کسی انسان کی عظمت میں چار چاند لگاتی ہو تو حضور مفتی اعظم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کہیں۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

''یہ ہمارے آباے کرام ہیں۔ اے جریر! اگر قوموں کی بھیڑ میں تمھیں کوئی ان کا مثل مل سکے تو لاؤ۔''

وہبی خوبیاں:

اس عنوان کے تحت میں سخت اُلجھن میں ہوں کہ قارئین پر اپنا ما فی الضمیر کس طرح ظاہر کروں۔ کیوں کہ قامت کی دل کشی، ناک نقشہ اور چہرہ مہرہ کی دل رُبائی، رنگ و روغن کے حسن، اعضا کی موزونیت، عادات و اطوار کی لطافت اور شخصیت کی دل آویزی کے بارے میں، اگر کسی جوان العمر انسان کا ذکر کیا جائے تو بات قرینِ قیاس ہے۔ لیکن یہاں ایک ایسے شخص کا ذکر ہے جو عمر کی اسّی منزلیں طے کر چکا تھا۔ سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ قامت کا وہ تناؤ جو جوانی کے ساتھ مخصوص ہے ختم ہو چکا تھا اور جسم کی کھال کہیں کہیں سکڑی معلوم ہوتی تھی، ان سب کے باوجود حال یہ تھا کہ جس راستے سے گزر جائیں، دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جائے۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں، لوگ ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہ جائیں۔ جس سے مصافحہ کر لیں وہ اسے اپنی سعادت تصور کرے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب آپ بیمار چل رہے تھے۔ ضعف و نقاہت کی وجہ سے آپ نے باہر کا سفر اور گھر کا دربارِ عام دونوں ہی موقوف کر دیا تھا اور تھوڑی دیر کا بیٹھنا بھی آپ پر بار تھا۔ عرسِ رضوی کے موقع پر لوگ بڑی جد و جہد کے ساتھ حضرت کو سہارا دے کر تھوڑی دیر کے لیے مجلسِ قل میں لائے۔ اختتامِ قل کے بعد مصافحہ کے لیے جو انسانوں کا ریلا چلا ہے تو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بڑی مشکل سے لائن بنائی گئی۔ مگر جو آتا

مصافحہ کے بعد دست بوسی اور دست بوسی کے بعد قدم بوسی، پھر قدم بوسی کے لیے جھکنے والے پر آپ کی ناگواری، اس کو ہاتھ سے روکنا اور **استغفر اللّٰہ استغفر اللّٰہ** پڑھنا۔ الغرض! جو آتا ٹلنا نہیں چاہتا تھا۔ اور آپ کے قرب کی دولت کو نعمتِ ابدی تصور کرتا۔ لوگ اس درجہ خود غرض ہو گئے تھے کہ اُنھیں حضرت کی کم زوری اور تکلیف کا بھی مطلق خیال نہ رہ گیا تھا۔

میں نے حضرت کی غیر معمولی تکلیف کا خیال کر کے لوگوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر زبردستی حضرت کے سامنے سے ہٹانا شروع کیا۔ آپ نے دو ایک دفعہ ہاتھ میری طرف اُٹھایا۔ مگر میں نے مطلب نہیں سمجھا؛ تو مولانا رحمانی میاں صاحب نے فرمایا: سختی سے لوگوں کو نہ ہٹایے، وہ بھی اپنے جذبۂ شوق سے مجبور ہیں۔ میں نے دل میں سوچا سبحان اللہ یہ لوگ حصولِ برکت کی دُھن میں اندھے ہو گئے ہیں اور اپنے اظہارِ شوق سے حضرت کو غیر معمولی تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ یہ لوگ تو مارنے کے لائق ہیں۔ اور خود حضرت کا یہ حال ہے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو اور ع

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پھر دل ان کے اتباعِ سنت کے وقار سے معمور ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں کا بھی یہی بیان ہے کہ خود تکلیف اُٹھا لیتے ہیں لیکن دوسروں کی دل شکنی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک صاحب آپ بیتی بیان فرماتے ہیں:

ما رایت معلما قبلہ ولا بعدہ احسن معلما منہ فواللّٰہ ماکھرنی ولاضربنی ولاشتمنی قال: ان ھٰذہ الصلاۃ لایصلح فیھا شئی من کلام الناس انما ھو التسبیح والتکبیر وقراءۃ القرآن.

(مسلم شریف، حدیث ۱۱۹۹، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، دار الکتاب العربی، بیروت)

''ایک انجان اعرابی نے مسجد نبوی میں پیشاب کر ڈالا، آپ نے نہ انھیں مارا نہ جھڑکا، نہ مسجد صاف کرنے کا انھیں حکم دیا، بلکہ نرمی سے انھیں سمجھایا، فرمایا: مسجدیں اس کام کے لیے نہیں اور صفائی کا دوسرے کو حکم دیا۔

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا؛ گزارش یہ کرنی تھی، لوگوں کے اس جذبۂ شوق اور وارفتگی

کا سبب آپ کی شخصیت کی دل کشی کے علاوہ اور کیا تھا؟ ہوسکتا ہے یہاں کسی کو خیال ہو۔ مذکورہ بالا واقعہ میں جس رجوعِ عام اور اظہارِ شوق کا ذکر کیا گیا ہے اس کا سبب آپ کی شخصیت کی دل کشی نہیں، بلکہ روحانیت اور بزرگی ہے۔ تو میں گزارش کروں گا کہ میں یہاں جس دل کشی کا ذکر کر رہا ہوں اس میں بزرگی میں کوئی مناسبت نہیں۔ میں یہاں کسی جوان العمر شخصیت کی دل کشی کا ذکر بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو ایک ایسی شخصیت کا ذکر کر رہا ہوں جس میں یہ دل آویزی، یہ جمال اور یہ دل کشی اس کی روحانیت اور بزرگی ہی نے پیدا کی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا.

(سورۂ مریم ۱۹/۹۶)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے اللہ پاک مخلوق کے دل میں ان کی محبت پیدا فرماتا ہے۔"

پھر بھی میں ایک ایسا واقعہ ذکر کر رہا ہوں جس میں مذکورہ بالا شبہہ کی بھی گنجائش نہیں۔

ایک دفعہ کلکتہ سے واپسی پر ہوڑہ اسٹیشن پر حضرت (مفتی اعظم) کا ساتھ ہو گیا۔ کچھ لوگ پہنچانے کے لیے بھی آئے تھے۔ گاڑی میں ابھی دیر تھی اور بنچیں ساری بھر گئی تھیں۔ اِس لیے زمین پر ہی حضرت کے لیے فرش بچھا دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سیکڑوں مسلموں اور غیر مسلموں نے آپ کو گھیر لیا۔ نہ کبھی کی دید نہ شنید، نہ تعارف مگر ہر انجان جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ کون بزرگ ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کہاں آئے تھے اور کہاں جائیں گے؟

میں کہوں گا عرس کی تقریب میں تو اس قبولِ عام کی وجہ عقیدت مندوں اور مریدوں کی معرفت تھی۔ ہوڑہ اسٹیشن پر انجانوں میں اس قبولِ عام کا سبب آپ کی پُرکشش شخصیت کے علاوہ اور کون سی چیز تھی۔ سراپا پر نظر پڑ گئی اور جم کر رہ گئی، قدم رُک گئے اور دل بے اختیار کھنچنے لگے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

خود میری وارفتگی اور گرویدگی کا سبب حضرت کا کوئی غیر معمولی علمی کارنامہ یا اُن کی عظیم بزرگی اور خدا رسیدگی نہیں ہے۔ مجھے پہلے سے اتنا معلوم تھا کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحب زادے ہیں؛ مگر جب دیکھا تو یہ اُن کی شخصیت کی دل کشی ہی تھی جس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ زندگی میں اُنھیں سیکڑوں بار دیکھا اور مختلف حالتوں میں دیکھا، مگر جب دیکھا جلال و وقار، حُسن و دل کشی کا مرقع دیکھا اور جس حال میں دیکھا اُن کی ہر اَدا دل کو بھاتی رہی۔

میں نے اُن کو بیٹھ کر تعویذ لکھتے ہوئے دیکھا ہے- اور بیش تر اوقات وہ تعویذ ہی لکھتے رہتے تھے۔ سر پر قیمتی بھاگل پوری عمامہ، جسم پر قیمتی چکن کا نہایت صاف کرتا، اس پر سنگھائی، پولسٹر یا قیمتی کپڑے کی رنگین صدری، گلے میں گلاب کے پھولوں کا خوش نما ہار، پیر میں علی گڑھی پائجامہ، جو چھالٹی کا بھی ہوتا اور ٹیری کاٹ کا بھی، جتنا جسم کپڑے سے باہر ہوتا نہ چونے کی طرح سفید نہ گیہوں کی طرح سُرخ بلکہ سفید گیہوں کی طرح دودھیا۔ اور چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک (حضور حافظِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ یہ چمک شب زندہ داروں اور تہجد گزاروں کی علامت ہے) بایاں زانو زمین پر رکھا ہوا اور دایاں کھڑا ہوا، اسی پر رکھ کر تعویذ لکھتے رہتے تھے۔ کاغذ پر تعویذ کے خانوں کی لکیر لوگ بائیں سے کھینچتے ہیں۔ آپ داہنے سے ہی بلا تکلف نہایت صاف سیدھی لکیریں بناتے تھے۔ کاغذ پھاڑنے کے لیے اس کو موڑنے اور نشان ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ تعویذ مکمل ہو گیا تو دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کے اشارے سے اور بائیں ہاتھ سے کاغذ دبا کر، جہاں سے ضرورت ہو بقیہ کاغذ آہستہ آہستہ الگ کر لیا اور کاغذ کبھی بے قاعدہ یا غلط نہیں پھٹتا تھا۔

اب میں کیا عرض کروں؟ عمامہ میں شان دار نظر آتے یا بدوضع، عام طور پر لوگ عمامہ اہتمام سے ہی باندھتے ہیں مگر حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے کبھی بھی عمامہ

اہتمام سے باندھتے نہیں دیکھا، باندھنے کی بجائے اس کو لپیٹنا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مگر زندگی میں کم لوگوں کو دیکھا جن کے سر پر عمامہ اتنا خوب صورت معلوم ہوتا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ عمامہ کی وضع انھیں کے فرقِ اقدس کے لیے ہوئی ہے۔

یوں ہی علمائے کرام میں ایک سے ایک مرصع لباس پہننے والے ملے۔ ان کی بڑائی کی وجہ سے میں ان کے لباس پر خاموش رہا ہوں یہ اور بات ہے کہ دل میں ہمیشہ ناگواری ہی رہی اور سادہ پسندی کی وجہ سے اکثر وبیشتر علمائے کرام کا میں شاکی ہی رہا، مگر اقرار کرتا ہوں کہ حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لباسِ فاخرہ کو میں نے ہمیشہ مستثنیٰ قرار دیا اور دل نے ہر بار یہی فیصلہ دیا کہ جس کے جسم پر لباس ایسا پھبتا ہو اس کو بلاشبہہ ہر عمر میں ایسا ہی لباس پہننے کا حق حاصل ہے۔ واللہ العظیم۔ میں نے اتنا جامہ زیب انسان وہ بھی اتنا بوڑھا دیکھا ہی نہیں۔

مالا گلاب کی ہو یا گیندے کی مجھے کبھی نہیں بھائی، اگر چہ خود بھی پہنا اور لوگوں کو بھی پہنے ہوئے دیکھا، مگر حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ- ان کے گلے میں سُرخ گلاب کی مالا ایسا زیب دیتی تھی کہ بار بار جی چاہا کہ ایک مالا خرید کر میں بھی گلے میں ڈال دوں۔ پھولوں کے ہجوم میں آپ کا چہرہ خود ایک پھول نظر آتا تھا۔

میں نے ان کو چلتے ہوئے بھی دیکھا ہے: مذکورہ لباس پر دبیز پولسٹر چکن کی ایک نیچے دامن، پوری آستین، بنگلے گلے کی عبا کا اضافہ ہوجاتا۔ دائیں ہاتھ میں عصا اور بائیں کو موڑ کر اس میں ایک رومال دابے ہوئے رہتے۔ دور سے معلوم ہوتا ایک خوب صورت گل دستہ ہولے ہولے حرکت کر رہا ہے، اس آہستگی اور نرمی سے زمین پر قدم رکھتے تھے کہ معلوم ہوتا پھول برس رہے ہیں۔ میں نے بار بار سوچا سبحان اللہ! زمین پر نرم قدم رکھ کر اور سر جھکا کر چلنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ جب اس سنتِ رسول کی نقل اتنی دل کش ہے تو صاحبِ سنت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل رفتار کس درجہ حسین ودل رُبا رہی ہوگی؟

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

میں نے آپ کو دسترخوان پر کھاتے بھی دیکھا ہے: جبل پور میں حضرت مولانا برہان الحق زید مجدہم کے یہاں آپ مہمان تھے۔ دسترخوان نہایت مکلّف اور وسیع تھا۔ اس علاقہ میں کڑھی بڑے اہتمام سے پکتی ہے، جو اتفاق سے حضور مفتی اعظم کو بھی مرغوب تھی۔ دسترخوان پر وہ بھی سامنے رکھی ہے، آپ ہاتھ سے اس کی پلیٹ ذرا اور کھسکا رہے ہیں، اور فرماتے ہیں مجھے زکام ہوا ہے، یہ نقصان کرے گی، اور لوگ منت وسماجت کر رہے ہیں، نہیں حضور یہ تو زکام کو مفید ہے۔ اس سے زکام بہہ کر صاف ہوجاتا ہے۔ الغرض! کافی عرض ومعروض کے بعد آپ نے اس سے تھوڑا شوق فرمایا۔ سُرخ مرچوں اور لہسن کی چٹنی بھی آپ کو پسند تھی۔ روٹی کا چھلکا شوربے میں ڈبو کر اس طرح منھ میں رکھتے کہ ہاتھ کا کم سے کم حصہ آلودہ ہوتا۔ تین انگلیوں سے کھانے کا انداز مسنون ہے۔ یہ حدیثوں میں پڑھا تھا۔ لیکن حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر اس کی عملی مشق بھی فراہم ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ یہ ڈھنگ حسن ونفاست سے بھرپور اور آنکھوں کو بھی بھلا لگنے والا ہے۔

مختصر لقمہ منھ میں رکھ کر منھ بند کر کے دیر تک چلاتے رہتے۔ ساتھ ہی سر کو بھی تھوڑی جنبش ہوتی رہتی۔ مجھے ان کے اس طرح منھ چلانے کا انداز بھی بے حد بھلا لگتا اور اُن کے ساتھ دسترخوان پر میں کام ودہن کی لذّت کے ساتھ حسنِ نظارہ کا کیف بھی حاصل کرتا تھا۔

ایک دفعہ مئو اسٹیشن پر اپنے ساتھ کھانے پر بٹھالیا۔ میں اپنی عادت کے موافق لمبے لمبے ہاتھ مارنے لگا۔ اور حضرت اپنی عادت کے موافق تناول فرمانے لگے۔ تھوڑی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ میں حضرت کے ساتھ کھانے کے لائق نہیں اور حسن وادب کے ساتھ کھانے کا سلیقہ بھی ایک فن ہے۔

ایک دفعہ آپ ٹرین میں سفر فرما رہے تھے۔ ڈبہ میں کسی غیر مسلم نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا۔ آپ نے فرمایا: میاں کھانا دائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ اس نے جواب

میں کہا: بابا میں مسلمان نہیں۔ مطلب یہ کہ مسلمان ہوتا تو دائیں ہاتھ سے کھاتا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا سنت ہے۔ آپ نے فرمایا، ارے میاں مسلمان نہیں ہو تو انسان تو ہو۔ سبحان اللہ! کیا عمدہ ہدایت ہے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا انسانیت کے بھی خلاف ہے۔

ایک دفعہ دعوت میں کھانے کے بعد کسی نے لائف بوائے صابن سے ہاتھ دُھلانا شروع کیا۔ فرمانے لگے: سبحان اللہ! کھانا کتنا عمدہ کھلایا اور ہاتھ اتنے بدبودار صابن سے دُھلایا۔ کھانے کے بعد کوئی خوش بودار صابن ہونا چاہیے۔

آپ کے کھانے کی نشست بھی عموماً ایک زانو موڑ کر اور دوسرا کھڑا کر کے ہوتی، میں نے آپ کو چار زانو بیٹھے کبھی نہیں دیکھا۔ سفر میں چاہے کتنے روز گزر جائیں مشتبہ اور دوکان کے کھانے سے پرہیز کرتے۔ حقہ مسلسل نوش کرتے مگر ہر کش نہایت خوش گوار اور باسلیقہ ہوتا۔

الغرض! آپ کا کھانا بھی حسن ونفاست اور خوش نمائی کا ایک خوش گوار عمل ہوتا اور جب آپ دسترخوان سے اُٹھتے تو معلوم ہوتا کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے، دسترخوان کو نوازا ہے۔

میں نے آپ کو بستر پر آرام کرتے بھی دیکھا ہے: پیلی بھیت میں عرسِ حشمتی کے موقع پر بعدِ قل مولانا مرحوم کے آنگن میں ہی حضرت کے لیے بستر لگا۔ میں نے دیکھا فی الوقت کوئی خادم نہیں ہے۔ تو تھوڑی دیر میں نے ہی پاؤں دبایا۔ آپ کے افعال متانت و آہستگی دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ کا جسم بے حد ملائم اور نرم ہوگا۔ مصافحہ کے وقت ہاتھ کی نرمی سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ آپ کی پنڈلیاں اور رانیں کافی سخت محسوس ہوئیں۔ دائیں کروٹ رُخسار کے نیچے ہاتھ رکھ کر، اور پاؤں ذرا سمیٹ کر آرام کر رہے تھے۔ سونے کے اس انداز کے بعد مجھے دوسرے تمام طریقوں پر تنقیدی نظر ڈالنی پڑی، اور اس کے مقابلے میں سب کو ہی رَد کرنا پڑا۔ پٹ سونے کی تو حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے۔ چت ہاتھ پاؤں پھیلا کر سونے میں مردے کا گمان ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ زندگی اور زندہ دلوں کا سونا وہی ہے جو -سنتِ رسول- ہے اور حضور مفتی اعظم جس پر

کاربند تھے۔

آپ کی نماز کا منظر بھی دیکھنے کا ہوتا تھا: گھر سے آپ کے برآمد ہوتے ہی کئی آدمی آپ کو آگے پیچھے سے گھیر لیتے، اور مسجد کے دروازہ تک پہنچتے پہنچتے جو مشکل سے پچاس قدم کی دوری پر ہوگا، کسی کو دست بوسی کا شرف بخشتے۔ کسی کو مصافحہ سے نوازتے اور کسی کے سلام کا جواب دیتے۔ اتنے میں مسجد کے دروازے میں داخل ہو جاتے۔ نہایت متانت و آہستگی سے **اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک** پڑھتے اور عمامہ اُتار کر وضو کے لیے بیٹھ جاتے۔ جو شخص عام انسانوں کے سامنے کبھی بھی سر کھول کر نہ آیا ہو؛ جس کو لوگوں نے علی العموم، تاجِ کرامت اور کلاہِ عزت کے ساتھ دیکھا ہو اور جو مسجد میں ابھی ابھی اس شکوہ کے ساتھ داخل ہو۔ وہ اپنے رب کے حضور یوں ننگے سر ہو کر خادمانہ حاضر ہو، یہ دیکھ کر دوسروں میں بھی جذبۂ عبودیت مچلنے لگتا تھا۔ خادم ایک بڑے لوٹے میں نصف کے قریب پانی پاس ہی رکھ دیتا اور آپ اسی متوضاء پر تشریف فرما ہوتے جہاں وضو کے لیے پائپ لگے ہوتے ہیں۔ پہلی بار جب میں نے یہ حالت دیکھی تو مجھے یہ طولِ عمل معلوم ہوا۔ لیکن دریافت سے معلوم ہوا کہ نل سے وضو کرنے میں پانی زیادہ ضائع ہوتا ہے اس لیے حضرت نل سے وضو پسند نہیں کرتے کہ وضو میں پانی کا ضائع کرنا -اسراف- ہے۔ میں نے پوچھا پانی کیوں آدھا لوٹا رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ لوٹا بھر دیا جائے تو حضرت کے ہاتھ سے اُٹھ نہ سکے گا۔ خیال ہوا کوئی دوسرا وضو کرا دیتا، دوسرے لمحہ خیال آیا وضو خود ہی کرنا مستحب ہے۔

سارے اعضا سنت کے موافق مکمل طور پر دُھلتے۔ چہرہ دُھلتے وقت البتہ دسیوں بار آنکھوں پر پانی کے چھینٹے دیتے چوں کہ کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا تھا کہ کہاں تو پانی کے استعمال میں وہ احتیاط اور کہاں یہ کشادہ دستی، دفعِ شبہہ کے لیے خود ہی فرما دیتے۔ بار بار آنکھیں چپک جاتی ہیں یعنی آنکھ سے بطورِ مرض جو پانی نکلے ناقضِ وضو ہے۔ پورے وضو میں -ادعیہ ماثورہ- کی تلاوت پست آواز میں جاری رہتی۔

ارکانِ نماز کی ادائیگی میں تو معہود طریقہ ہی برتتے، لیکن خشوع وخضوع کا یہ عالم

تھا کہ پوری نماز میں آپ کے وجود پر عبودیت کی شان اور بندگی کا جمال طاری رہتا تھا۔ دیکھنے والا دور سے ہی فیصلہ کر لیتا تھا کہ ایک مومن قانت نے اپنے مولا کی رضا جوئی کے لیے اپنے وجود کو عجز و درماندگی اور عرض والتماس کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ **و قوموا للّٰه قانتين.**

آخری اوقات میں جب ضعف ونقاہت میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا اور بیٹھے رہنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ یہ دیکھا گیا کہ مسجد میں جب تک بیٹھے ہیں مسلسل کراہ رہے ہیں۔ اُٹھتے ہیں تو سہارا دیا جاتا ہے۔ بیٹھتے ہیں تو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چلتے ہیں تو لوگ دونوں طرف سے سنبھالے رہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی تکبیر شروع ہوئی ایسی چستی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے جیسے کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔ پوری نماز قیام و رکوع کے ساتھ نہایت تن دہی اور مستعدی کے ساتھ ادا کرتے اور اُف تک کی صدا لب تک نہ آتی۔ جیسے قیام وقعود اور رکوع وسجود کی مشقتیں خشیتِ الٰہی اور خوفِ ربانی میں تحلیل ہو گئی ہوں کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ. (سورۂ بقرہ ۲/ ۴۵)

''بے شک نماز سخت بوجھل اور گراں ہے مگر اللہ کے خوف سے ڈرنے والوں کے لیے۔''

یا یوں کہیے کہ ساری کلفتیں راحت و آرام میں بدل گئیں کہ ارشادِ نبوی ہے:

قرة عيني في الصلوٰة. ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین نماز ہے۔''

ہماری مذکورہ بالا تحریر کا مقصد یہ تھا کہ علم وفضل وتقویٰ وطہارت اور دیگر اخلاقِ فاضلہ سے قطعِ نظر خود آپ کی ذاتِ بابرکات بھی اتنی پُرکشش تھی کہ بے اختیار دل مائل ہونے لگتے، آنکھیں فرطِ عقیدت سے جھکنے لگتیں اور روح کی دُنیا مسخر ہونے لگتی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی ذاتِ مبارک پر تسخیرِ قلوب واطاعتِ اذہان اور محبوبیتِ عیون و ابصار کی خلعتِ فاخرہ ڈال رکھی تھی۔ اس سلسلے کی ایک اور خاص بات جس کو میں نے نوٹ کیا اور جو آپ میں اور شموگہ کے ایک بزرگ حضرت درویش بابا میں، میں نے مشترک دیکھی یہ تھی کہ اخیر عمر میں جب جسم گھل کر بالکل ہاڑ رہ گیا تھا۔ اس وقت بھی چہرہ پر گوشت اور نہایت

بارونق تھا۔ چہرہ دیکھ کر کوئی یہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتا تھا کہ اندر سے یہ اس درجہ دُبلے ہوں گے۔ حضرت درویش (بابا) کو تو میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو اس طرح دیکھنے کا زندگی میں صرف ایک بار موقع ملا۔ جب ایک دفعہ بغل بنوانے کے لیے لوگوں نے جسم سے کپڑا ہٹایا تو مجھے شدید احساس ہوا کہ چہرے اور جسم کے اس تفاوت کی خصوصیت حضرت میں بھی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ تسخیرِ خلائق اور شخصیت کی دل کشی کا جوہر بھی روحانیت کی برکت اور قربت خدا و رسول کا ہی ثمرہ ہے۔

کسبی محاسن:

حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کسبی کمالات کے لیے تو ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ سوادِ اعظم اہل سنت و جماعت کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ متعدد دینی کتابوں کے بالغ نظر مصنف تھے، اہلِ دل صوفی اور باکمال بزرگ تھے، بلکہ میرے نزدیک معمولاتِ ذکر وفکر میں ان کی ایک مجتہدانہ شان تھی، وعظ وتقریر نہیں فرماتے تھے، لیکن لوگوں کی رُشد وہدایت کے لیے ان کے چند جملے لمبی لمبی تقریروں پر بھاری تھے۔ داد و دہش اور بذل وعطا میں شاہانہ انداز تھا۔ مدّتوں - مدرسہ مظہرِ اسلام - ان کے ذاتی صرفہ سے چلتا رہا۔ اُنھوں نے ہزاروں مقدمات کا منصفانہ فیصلہ فرمایا۔ مختصر یہ کہ آپ کی کسبی خصوصیات سے متعلق اسی طرح کے بیسیوں عنوان ہیں اور ہر عنوان قلم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہے۔ مگر اس مختصر مضمون میں ان سب کی گنجائش کہاں۔ میں اس وقت صرف اتباعِ شرع ومتابعتِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

(۱) جمعہ کے دن مصلیوں کی گردن پھلانگ کر آگے جانے والوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک وعید ہے:

من تخطى رقاب الناس يوم الجمعة اتخذ جسرا الى جهنم

(مشکوٰۃ شریف، حدیث ۱۳۹۲، دار الفکر، بیروت)

’’جس نے جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگیں، اس نے جہنم کی طرف پل بنایا۔‘‘

اس فرمانِ والا شان کے بموجب شریعتِ اسلامیہ کا یہ حکم ہے کہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں مصلیوں کی گردن پھلانگ کر آگے جانا شرعاً ممنوع اور معصیت ہے۔ ہاں اگلی صف والوں نے جگہ چھوڑ رکھی ہو تو اسے پُر کرنے کے لیے آگے جایا جا سکتا ہے، کہ صف پُر کیے بغیر پیچھے بیٹھ کر ان لوگوں نے اپنی حرمت خود ضائع کی۔

اس شرعی مسئلہ کو مدِ نظر رکھ کر مندرجہ ذیل واقعہ ملاحظہ فرمائیں:

۳۰۔۳۵؍ سال پہلے کی بات ہے کہ اشرفیہ کے سابق ناظم الحاج محمد عمر صاحب مرحوم کے خلف الصدق حضرت مولانا نثار احمد صاحب غالباً پہلی بار مبارک پور میں حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو لائے اور آپ کی یہ تشریف آوری بالکل نجی اور بغیر کسی سابقہ اطلاع کے صرف شخصی دعوت پر ہوئی، اس لیے عوام اہل سنت تو کیا، اشرفیہ کے لوگوں کو بھی اس کی پیشگی خبر نہ ہو سکی۔ دن جمعہ کا تھا، جمعہ کے وقت مولانا نثار احمد صاحب حضرت کو لے کر اس وقت پہنچے کہ مسجد بھر چکی تھی، موسم گرمی کے تھے اس لیے مصلیوں کی آخری صفیں دھوپ سے بچنے کے لیے بالکل مسجد سے ملی جلی مسجد کی پوربی دیوار کے سایہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

حضرت کرتا پائجامہ اور غالباً زرد رنگ کی صدری اور دو پلی ٹوپی اوڑھے ہوئے تشریف لائے، گرمی سے بچنے کے لیے تولیہ سر پر ڈال رکھا تھا۔ آج سے لگ بھگ تیس پینتیس سال قبل اہلِ مبارک پور کے دل میں، علما و مشائخ کی جو قدر و منزلت تھی، اِدھر حضرت کا پُر نور چہرہ اور دل کش شخصیت پھر ساتھ میں مولانا نثار احمد لوگوں نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ کوئی بڑے عالمِ دین ہیں، اچھے بزرگ ہیں، اور اِدھر اُدھر کھسک کر آگے جانے کے لیے آپ کو راستہ دینے لگے کیوں کہ مسجد میں علما کے ساتھ ان کے احترامِ عقیدت کا یہی معمول تھا۔ لیکن حضور مفتی اعظم دھوپ میں ہی تولیہ بچھا کر سب سے پیچھے بیٹھ گئے؛ اصرار کے باوجود آگے نہیں بڑھے۔ یہ سارا واقعہ ادھر بھی ہو رہا تھا جدھر میں تھا۔ نماز کے بعد میں نے معلوم کرنا چاہا یہ کون بزرگ تھے تو معلوم ہوا کہ مفتی اعظم ہند!

غالباً یہ میری پہلی زیارت تھی، دل نے فیصلہ کیا سبحان اللہ! مسئلہ ہم لوگ بھی پڑھتے ہیں لیکن صرف پڑھنے کے لیے اور یہ اللہ والے پڑھتے ہیں تو عمل کرنے کے لیے۔ آپ کے اس عمل میں اتباعِ شریعت کے ساتھ احیاے سنت بھی پائی جا رہی ہے؛ کہ لوگ آج کل اس سے غافل ہیں، اور مسجد میں لوگوں کی گردنیں پھلانگنے میں کوئی خوف نہیں محسوس کرتے۔

(۲) گزشتہ صفحات میں ہم نے ایک حدیث نقل کی کہ مسجد اُمورِ دُنیا کے لیے نہیں ہے۔ اسی حدیث کی روشنی میں حضرات علماے شرع نے مسجد میں کھانے پینے اور سونے، تجارت وغیرہ اُمورِ دُنیا سے منع فرمایا، صرف معتکف کو اجازت ہے، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مسجد آلودہ نہ ہو؛ اور اسی لیے یہ مستحب ہے کہ آدمی مسجد میں جب بھی داخل ہو اعتکاف کی نیت کرے اور کچھ ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ اگر بہ ضرورت کچھ کھانا پڑے تو معتکف ہونے کی وجہ سے اس کی اباحت ہو گی۔

مسئلۂ شرعی ذہن نشین کر لینے کے بعد حضرت کی احتیاطِ شرعی ملاحظہ ہو۔

ایک دفعہ بریلی حاضری ہوئی۔ اور رات میں قیام کا اتفاق پڑا۔ شہر کے کسی حصہ میں -میلاد شریف- کی تقریر تھی۔ حضرت کے ساتھ میں بھی شریکِ جلسہ ہوا، جلسۂ میلاد ایک مسجد میں تھا اور نہایت مختصر سامعین تھے۔

مجمع کم ہو یا زیادہ میرا بارہا کا یہ تجربہ ہے کہ جس جلسے میں حضور مفتی اعظم یا حضور حافظِ ملت ہوں وہ جلسہ بے حد پُر کیف ہو جاتا تھا۔ تقریر خوب جمتی تھی اور مقرر اور سامع دونوں ہی کافی محظوظ ہوتے تھے۔ چناں چہ اس جلسہ میں بھی روایت خوانی کے بعد میں نے تقریر شروع کی۔ مختصر تعداد کے باوجود جلسہ بے حد پُر کیف اور کام یاب رہا، اور آپ حسبِ معمول جلسہ میں آنکھیں بند کیے تشریف فرما رہے۔ کوئی خاص مقام آتا تو آنکھیں کھول کر مقرر کو دیکھ لیتے اور جب بہت تاثر ہوتا تو آنکھیں بھیگ جاتیں اور ڈبڈبائی نظروں سے دیر تک مقرر کو تکتے رہتے۔

ختمِ وعظ کے بعد صاحبِ مجلس نے حاضرین کی چائے سے تواضع کی، حضرت نے

چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا: ہم نے مسجد میں داخل ہوتے وقت اعتکاف کی نیت کر لی تھی جس نے نہ کی ہو اب کر لے کہ مسجد میں غیر معتکف کو کھانا پینا منع ہے۔

بادی النظر میں یہ معمولی ادب ہے۔لیکن غور سے دیکھا جائے تو جو شخص شریعت کے کسی ادنیٰ درجہ کے ادب پر بھی اس شدت کے ساتھ مواظبت فرمائے؛ دیگر احکامِ شرعیہ کی بجا آوری میں اس کا کیا حال ہوگا۔ساتھ ہی اس واقعہ سے رفعِ شبہ اور ہدایتِ خلق کے اہتمام کا بھی پتا چلتا ہے۔

(۳) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے، جس سے مسلمانوں کی حقیقی شان اور ان کے داعیِ حق ہونے کے منصب کا اظہار ہوتا ہے:

من رای منکم منکراً فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه وان لم یستطع فبقلبه وذلک اضعف الایمان. (کنز العمال، حدیث ۵۵۲۴، بیت الافکار الدولیہ، الریاض)

''تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر ہاتھ سے بدلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی برائی بیان کرے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا کم زور ترین درجہ ہے۔''

اور اسی اَمر کو قرآنِ عظیم نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آل عمران ۳/۱۱۰)

''تم لوگ بہترین اُمت ہو جو انسانوں کے لیے بنائے گئے ہو تا کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور برائیوں سے روکو۔''

مگر اسلام میں جتنی اس کی تاکید ہے۔ عام لوگ اسی نسبت سے مداہنت اور زمانہ سازی میں بکثرت مبتلا ہیں۔ خاص خاص مردانِ حق اور خاصانِ خدا البتہ ہر زمانہ میں اس فرضِ منصبی پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ حدیث مبارک میں ایسے ہی لوگوں کی مدح فرمائی گئی ہے:

لا یزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرین لا یضرهم من خالفهم

حتیٰ یاتی امر اللّٰہ. (مسند امام احمد بن حنبل، حدیث ۲۲۳۹۵، موسسۃ الرسالہ، بیروت)

''میری اُمت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور اس باب میں اسے کسی کے لعنت و ملامت کی پرواہ نہ ہوگی۔''

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس وصف میں اپنے اہلِ زمانہ میں ممتاز مشارٌ الیہ تھے، چنان چہ ناممکن تھا کہ کوئی غلط بات حضرت کے سامنے ہو جائے اور حضرت اس کی اصلاح نہ فرمائیں۔

آپ کی مجلس میں تعویذ کے لیے مَردوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ کسی عورت کا ہاتھ بھی بے پردہ ہو جائے، جہاں کسی سے بداحتیاطی ہوئی، اور آپ کی ڈانٹ پڑی، **لا الہ الا اللّٰہ، استغفر اللّٰہ، استغفر اللّٰہ**، اری اپنا ہاتھ ڈھانک، بے غیرت۔ مجھ بڈھے کو اپنا ننگا ہاتھ دکھانے آئی ہے۔ اور پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا اور سب نے اپنے کپڑے درست کر لیے۔

ایک دفعہ دوا پٹوڈیٹ اور بے پردہ مسلمان عورتیں ساری میں ملبوس کہیں دور سے تعویذ لینے کے لیے آئیں۔ آپ نے تعویذ لکھتے لکھتے نظر جو اُٹھائی تو نگاہ اُن پر پڑ گئی، فوراً رُخ پھیر لیا، اور سر نیچا کیے ہوئے لگ بھگ پندرہ منٹ تک ان کی سرزنش کرتے رہے۔ انداز کچھ نرم اور بے حد تحسر آمیز تھا۔ گویا اُنھیں دِلی تکلیف پہنچی ہو، جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا: نہ اللہ و رسول کے حکم کا خوف، نہ اپنے طرزِ معاشرت کی پرواہ، نہ انجام کا خیال۔ اتنی دور سے تنہا عورتیں چلی آئیں، ساتھ میں کوئی محرم نہیں۔ اس پر ظلم یہ کہ بے پردہ، مزید ستم یہ کہ لباس بھی مسلمانوں کا نہیں۔ ٹرینوں میں حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ ان پر کوئی زیادتی ہو تو مسلمان کیسے ان کی حمایت کریں، کسی حادثہ میں مر جائیں تو یہ کیسے پتا چلے کہ مسلمان ہیں؟ خیال فرمایے کہ نہ مٹی نہ جنازہ یوں ہی پھونک دی جائیں گی۔ یہ سب وبال

اللہ ورسول کے حکم کی خلاف ورزی کا۔ وہ عورتیں بے حد شرمسار اور جزبز ہوئیں، لیکن ان کے پاس پردے کا تو کوئی اہتمام تھا ہی نہیں؛ کرتیں کیا؟

حضرات مقررین نے کبھی جوشِ بیان میں کبھی نقطۂ زبان سے اور کبھی لاعلمی اور جہالت سے (کہ آج کل تقریر کے لیے رسوخِ علم ضروری نہیں رہ گیا ہے) دورانِ تقریر ایسے جملے صادر ہو جاتے ہیں جو شرعاً، عقلاً، یا زبان و بیان کے لحاظ سے قابلِ اعتراض ہوتے ہیں۔ اگر مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اسٹیج پر ہیں تو کیا مجال ہے کہ کوئی مقرر ایسی بداحتیاطی کر کے گزر جائے، اور آپ –امر بالمعروف– نہ فرمائیں۔ کئی بڑے خطبا سے تو برسرِ منبر انھوں نے توبہ تک کرائی؛ خود اپنی زندگی میں مجھے دو مرتبہ ایسی سرزنش سے پالا پڑا ہے۔ توبہ تک کی نوبت البتہ نہیں آئی۔

ضلع گیا کے جلسہ میں ایک بار آپ کے ساتھ شرکت کا اتفاق ہوا۔ رات میں تقریر کے دوران میں نے یہ کہا کہ: ”اللہ تعالیٰ نے قرآنِ عظیم میں لفظ نور استعمال فرمایا۔“ تقریر ختم ہوئی اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، ان کے فیضِ صحبت سے محفل بڑی پُرکیف پُرنور رہی۔ دوسرے دن ساتھ ہی گھوسی کے لیے واپسی ہوئی، راستہ میں بڑے خوش گوار ماحول میں باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران آپ نے فرمایا: ”رات آپ نے تقریر میں اللہ کے لیے عمل کا لفظ استعمال فرمایا۔ اگر کہیں قرآن و حدیث میں یہ لفظ ذاتِ باری کے لیے آیا ہو، تب تو اس کا بولنا صحیح ہوگا ورنہ نہیں۔ امر کی تحقیق کر لیجیے گا۔“ آج پندرہ بیس سال ہو گئے اور میں اس سلسلہ میں غور کرتا رہتا ہوں مجھے تو کوئی ایسا محلِ استعمال نہ ملا۔

دوسری بار مغربی یوپی کے ہی کسی علاقہ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا: ”بدنصیب مسلمان آج کل رات میں بارہ بجے تک سنیما دیکھتے ہیں اور دن میں بارہ بجے تک سوتے ہیں۔“ اک بیک بازو سے میری طرف پوری طرح مخاطب ہو کر کہا نہایت بلند آواز میں، بے حد بیزاری کے ساتھ گویا مجھ پر پھٹ پڑے: ”مولانا! میں اِس کو مان نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بدنصیب ہو۔ آپ اس کو بدنصیب نہ کہیے کچھ اور کہہ لیجیے،

حق یہ ہے کہ جس اُمت کے نگہ بان رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں وہ بدقسمت کیسے ہو سکتی ہے۔“ ؎

چہ غم دیوار اُمت را کہ دارد چوں تو پشتیبان
چہ باک از موج بحر آن را کہ دارد چوں تو کشتیبان

اُمت کی دیوار کو کیا غم جو تیرے جیسا سہارا رکھتی ہے اور طوفانِ نوح سے اس کو کیا خوف جو تیرے جیسا کھیون ہار رکھتی ہے۔

اور لسان و بیان کی اِصلاح کا انداز بے حد دلچسپ اور پُرلطف ہوتا تھا۔ ایک دفعہ لوگوں نے آپ کے سامنے کہنا شروع کیا: طوفان (ایکسپریس) ایک بجے آرہا ہے۔ ایک بجے طوفان آرہا ہے۔ کئی بار اِس جملے کو سُن چکے تو فرمایا: ”سبحان اللہ! بولنے کا کیا انداز ہے۔ طوفان آرہا ہے، طوفان آرہا ہے؛ میاں! کہنا ہی ہے تو یوں کہو: ایک بجے بریلی اسٹیشن سے طوفان گزر جائے گا۔“ سبحان اللہ! بات وہی ہے لیکن پہلے جملے کا ظاہر بے حد بھیانک ہے اور دوسرے کا ظاہر و باطن یکساں خوش گوار، تھوڑے سے تصرف نے قبح کو حسن بنا ڈالا۔

فتاویٰ رضویہ، جلد سوم شائع ہوئی تو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک نسخہ لے کر حاضرِ خدمت ہوا۔ خیال ہوا کہ اس کا پیش لفظ سُنا دیا جائے، پیش لفظ میں ایک جگہ حضور اعلیٰ حضرت کے غیر معمولی قوتِ حافظہ کے بارے میں تحریر تھا: ”حافظہ اس بلا کا تھا“ پوری زندگی ہم نے اس جملے کو بار بار مقامِ مدح ہی سُنا تھا۔ سُن کر حضرت نے فرمایا: ”واہ واہ! آپ نے حضرت کے حافظے کی تعریف فرمائی ہے، یا آپ کی تنقیص کی ہے۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا، یہ– بلا– کون سی چیز ہے۔“ تب مجھے احساس ہوا حضرتِ والا زبان و بیان کا بھی کس درجہ لطیف ذوق رکھتے تھے اور اس کی باریکیوں پر کیسی مہارتِ تامہ حاصل تھی!

الغرض! آپ کی بارگاہ میں شرعی لغزش ہو یا اخلاقی ولسانی؛ سب پر پوری دار و گیر ہوتی اور اعلانِ حق اور –امر بالمعروف– کا پورا پورا حق ادا کیا جاتا۔ اس ضمن میں یہاں جس خاص واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں، وہ بھی ایک غیر معمولی وقوعہ ہے۔

حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک سچے مسلمان کے حوصلہ ایمانی کے ساتھ یکا وتنہا میدانِ عمل میں اُتر پڑے تھے اور نئی تعمیرات کے سنگِ بنیاد کے موقع پر ایک آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کا اعلان فرما چکے تھے۔

کانفرنس ہوئی اور بے مثال ہوئی۔ اس میں ازرہِ دین پروری حضور مفتی اعظم اور حضرت مولانا سید آلِ مصطفیٰ علیہ الرحمہ بھی شریک ہوئے، کچھ عقیدت مندوں نے اہلِ کچھوچھہ کے بائی کاٹ سے متاثر ہوکر اس خاندان کی دوسری شاخ (اہلِ بسکھاری) کے سجادہ نشیں معروف بہ بابو میاں کو شرکت کی دعوت دی تو وہ بھی شریک ہوئے۔

علماے دیوبند کے خلاف علماے عرب وعجم کے فتویٰ کفر سے ساری دُنیا واقف ہے۔ اور اعلیٰ حضرت اور ان کے خاندان کو اس سلسلہ میں حق کی حمایت اور سچ کی جنبہ داری میں جو تقدم حاصل ہے وہ کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ بابو میاں جن کے اجداد پر دیوبندیوں کی حمایت کا الزام تھا۔ اس جلسۂ سنگِ بنیاد میں شرکت کے موقع پر حضور مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے دارالعلوم اشرفیہ کی نچلی منزل کے مغربی کمرہ میں آئے۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو سلام کیا، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور خود ہی تعارف کرایا ہوگا یا کسی نے بتایا ہوگا۔ یا پہلے سے ہی حضرت کو معلوم تھا۔ بہرحال حضرت نے نہ سلام کا جواب دیا؛ نہ مصافحہ کیا۔ بلکہ فرمایا: صاحب آپ کے خاندان کے لوگ علماے دیوبند کے حامی رہے ہیں اور ان پر علماے عرب وعجم کے کفر کے فتوے ہیں۔ اگر آپ بھی اس روش میں ان کے ہی ہم راہ ہیں تو میں آپ سے کیسے سلام وکلام کرسکتا ہوں جب کہ حدیث شریف میں ایسے لوگوں سے قطعِ تعلق کا حکم آیا ہے؟

بابو میاں نے کہا حضور میں کبراے دیوبند کی تکفیر میں ساری دُنیا کے اہلِ اسلام کا ساتھی ہوں، چنان چہ اسی وقت انھوں نے اس مضمون کی اپنی دستخطی تحریر مفتی اعظم کے حضور میں پیش کی۔

اس وقت لوگوں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا، حضور مفتی اعظم نے بابو میاں

سے فرمایا۔ صاحب زادے آپ ذرا کھڑے ہوجائیں۔ نہ تو بابو میاں یہ سمجھے کہ کیوں یہ حکم ہو رہا ہے، نہ مجلس میں بیٹھنے والے ہی۔ مگر جب حکم پاکر بابو میاں کھڑے ہوئے تو حضور مفتی اعظم نے بہ آن شان وجلال، بہ آن عظمت وتقدس و بہ آن ریشِ سفید ورفعتِ پیری، ایک سبزہ آغاز نوجوان (بابو میاں) کا پیر دونوں ہاتھ سے پکڑ لیا۔ ڈبڈبائی آنکھیں ان کے چہرہ کی طرف اُٹھا کر فرمایا: صاحب زادے ہم تو آپ کے غلام وخانہ زادے ہیں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے آپ کے ہی جدِ کریم کا دیا ہوا ہے۔ ہم نے شروع میں جو کیا آپ کے ہی جدِ کریم کے حکم کی بجا آوری اور اُنھیں کے دین کا پرچم بلند کرنے کے لیے کیا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ ایک چاکر اپنے مالک کے پاؤں پکڑ کر اس سے معافی مانگ رہا ہے۔ اس وقت پورے مجمع پر رقّت طاری تھی اور کھلی آنکھوں سے دُنیا دیکھ رہی تھی کہ بلا شبہہ حق وہدایت، اطاعتِ شرع و اتباعِ سنت انھیں بزرگوں کے دَم قدم سے ہے۔

درود ہو میرے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جنھوں نے فرمایا: **من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ** ''جو برائی دیکھے اپنے ہاتھ سے اُسے درست کرے اور سلام ہو حضور مفتی اعظم پر کہ آپ نے سرکار (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس حکم پر پوری زندگی عمل کرکے شاہراہِ حق قائم فرمادی۔

